Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بس، اب شرط پُوری ہو گئی۔"

"کہاں پُوری ہُوئی؟ چاروں بٹن کھولو تو ہو گی۔"

"جی نہیں۔ آپ شرط اَپنے پاس رکھیئے۔ سرفراز، اِن حرکتوں سے باز آؤ، ورنہ۔۔۔۔"

"ورنہ کیا؟"

"چیخ مار کر لوگوں کو اِکٹھا کر لُوں گی۔ تُمہاری کپتنی دھری رہ جائے گی۔"

"چلو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔"

"اچھا ہٹو۔ ہاتھ ہٹاؤ، باز آؤ ایک مِنٹ کے لئے۔۔۔۔ باز آؤ ناء۔ یہ لو، دیکھو، صاف جلد ہے، کوئی بال نہیں۔"

"گردن کے گڑھے تک صاف ہے۔ آگے چلو۔"

"جی معاف کرو۔ آگے بھی صاف ہے۔"

"اچھا آنکھیں بند کرو۔"

"جی نہیں۔ میں اب تُمہاری چالوں میں آنے والی نہیں۔"

"یہ دیکھو میرا ہاتھ، دیکھ رہی ہو؟"

"ہاں۔"

"پتا ہے اِس کا مطلب کیا ہے؟"

"نہیں۔"

"اِس طرح ہاتھ اُٹھا کر قسَم کھاتے ہیَں۔"

"پھر؟"

"قسَم کھاتا ہوں ہاتھ نہیں چلاؤں گا۔"

"تُمہاری قسَم کا کیا اعتبار۔"

"میں فوج کا افسر ہوں۔ آفیسر اینڈ اے جنٹل مین۔ ہم لوگ قسَم کی خاطر جان دے دیتے ہیَں۔"

"اچھا لو۔ بس؟"

"ارے واہ۔ ایک سیکنڈ سے کیا ہوتا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا اندھوں کی طرح آنکھیں میچ کر بیٹھ جاؤں؟"

"دس سیکنڈ تک۔"

"دس سیکنڈ؟"

"دس تک گنو پھر آنکھیں کھول دو۔"

"اچھا، ایک دو تین چار پانچ چھ ---- ام ---- م م م ---- مم میری سانس۔ خُدا کے لئے، میری سانس بند ہو رہی ہے۔ ہٹو، کیا بیہُودہ آدمی ہو۔ یہ قیمت ہے تمہاری قسم کی؟"

"ہاتھ تو نہیں چلایا۔"

"اور لیا کیا ہے؟"

"ہونٹ چلائے ہیں۔ قسم تو نہیں ٹوٹی۔ آگئی ناء چال میں؟ اِسے کہتے ہیں ٹیکٹِکس۔"

"مکار۔"

"اب قسم ختم ہوگئی۔ اب میں ہاتھ چلاؤں گا۔ چپکی بیٹھی رہو۔"

"ہائے سری اب مجھ میں ہمت نہیں۔"

"ہلو مت۔"

"ہائے مَیں مری---"

"یہ دیکھو بال، یہ ایک بال ہے، عین چھاتی کے اُوپر، کھینچ کر توڑ دُوں؟"

"اوہ---- ہائے، ظالم درد کرتے ہو؟"

"بڑا پیارا بال ہے۔ کیسی نازک جگہ پہ اگا ہے۔ یہ تو ہونٹ سے توڑنے کے لائق ہے۔"

"ہائے، ہائے، سری ی ی ---- میری جان گئی----"

لبوں پہ تلخ مسکراہٹ لئے ہُوئے، بدن کو گاڑی کے ہلکوروں کے سپُرد کئے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرفراز آہستہ آہستہ نیند کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔ خُوابوں کا نقطہ آغاز اُس کے تعیّن میں نہ تھا، گو نیند ٹُوٹنے پہ اُسے محسُوس ہوا کہ جیسے آنکھ لگتے ہی خُوابوں کی یلغار شرُوع ہو گئی ہو۔ البتہ اُن کے اختتام سے فرار ناممکن تھا۔ ایک بدصُورت سا آدمی چھانٹا اُوپر اُٹھائے اُس کے سَر پہ کھڑا تھا اَور سرفراز گھوڑے کی مانِند تانگے کے آگے جتا اُسے کھینچتا جا رہا تھا۔ یہ آخری خُواب تھا جِس کے دھکّے سے چونک کر وہ جاگ اُٹھا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ پہلے ایک طوطا تھا جِس نے ٹیں ٹیں کرتے ہُوئے یکایک اَپنی صُورت بدَل کر چھانٹا بردار کوچوان کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اُس کالی ڈاڑھی والے کوچوان کی شکل خَوفناک تھی۔ اُس کی آنکھوں سے خُون ٹپک رہا تھا اَور وہ سرفراز کو تانگے کے آگے ہانک رہا تھا۔ سرفراز گھوڑے کی جگہ پہ جتا تیزی سے پاؤں چلاتا جا رہا تھا مگر اُس کے پیروں تلے زمین خُودکار حرکت سے پیچھے ہی پیچھے کو سرکتی جاتی تھی، جِس کی وجہ سے راستہ ایک انچ بھی طے نہیں ہو پاتا تھا۔ وہ لاکھ کوشش کرتا کہ تیز بھاگے مگر زمین کی پٹی بھی اُلٹے پاؤں تیز تر ہوتی جا رہی تھی، اَور اِس دہشت کے مارے کہ وہ اَپنے مقام سے آگے بڑھ نہیں پا رہا اُس کا دِل کُچلا جا رہا تھا اَور سانس بند ہُوئی جاتی تھی، جیسے کہ کوچوان کی مٹھی میں چھانٹا نہیں بلکہ سرفراز کا دِل ہو جِسے وہ اَپنی مشت میں بھینچ بھینچ کر مسل رہا ہو۔

اسی بے دم حالت میں جب کہ اُس کی سانس سینے کے اَندر ایک ہُوک کی مانِند اُٹھ رہی تھی، سرفراز کی نیند ٹُوٹ گئی۔ آنکھیں بند کئے، نیم ہوش بدَن کو سیٹ پر سنبھالے وہ خُواب کے ہَوکے میں اُسی طرح لیٹا رہا۔ لحظہ لحظہ پُورے ہوش میں سَر نکالتے ہُوئے اُس کے دِل کو یہ جان کر بے اِنتہا طمانیت کا احساس ہُوا کہ اُس نے جو دیکھا وہ اصلیت نہیں تھی، اَور حقیقت حال یُوں تھی کہ وہ، میجر سرفراز، ایئر کنڈیشنڈ کمرے کے اَندر آرام سے نرم سیٹ پر لیٹا ریل کا سفر کر رہا تھا، جِس کے آخر میں اُس کے استقبال کے لئے اُس کا اُردلی جیپ لئے سٹیشن پر موجُود ہو گا۔ اِس خیال کا سہارا کُچھ اِس طرح سے اُس کے احساس میں داخل ہوا جیسے اُس کے جسم میں دوبارہ جان پڑ گئی ہو۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ دِن ختم ہو چکا تھا۔ گاڑی کِسی سٹیشن پہ کھڑی تھی۔ سیاہ آسمان کے نیچے بجلی کی روشنیوں میں مسافروں اَور پھیری والوں کے سائے کھڑکی کے باہر مُحرّک تھے۔ خُوابوں کے بچے کھچے نظارے اَبھی تک سرفراز کے ذہن سے لپٹے تھے۔ اُس نے ایک نظر کھڑکی پہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈال کر آنکھیں میچ لیں۔ خُواب ناقابلِ اعتبار تھے، اُس نے سوچا۔ خُواہ میں گھوڑا بن جاؤں، گھوڑا ہاتھی بن جائے، ہاتھی آدمی کی آواز میں مخاطب ہو، آدمی سے بچّے کی آواز نکلے اَور پھر بچہ عورت کا رُوپ دھار لے، برسوں کے مرے ہُوئے زندہ ہو کر بولنے لگیں، کِسی بات پہ، کِسی واقعہ پر فہم بدگمان نہ ہوتا تھا، ہر حال اَور ہر بھیس کو بے چُوں وچراں تسلیم کرلیتا تھا۔ بچّے اَور جوان میں تیس سال کا عرصہ ہو یا بیس برس کا، خُواب اِس تنازعے سے بالاتر تھے۔ بچہ اَور جوان، مرد اَور عورت، زندہ اَور مردہ، سب ایک دُوسرے میں مدغم، ایک ہی وَقت میں، ایک ہی جگہ پر موجُود ہوتے تھے، اپنا اپنا کاروکسب، اَپنے اَپنے زمانے لئے، ایک دُوسرے کے زمانوں کے اَندر باہر دندناتے پھرتے تھے۔ خُوابوں کا اپنا ایک الگ فہم تھا۔ صرف ہوش مندی بھروسے کے لائق تھی اَور آدمی کے ذہن کی یادداشت اِس کے لنگر کا کام دیتی تھی۔ جِس مقام پہ یاد کا لنگر ڈال دیا جاتا اُسی نقطے پہ حال کا زمانہ تھم جاتا اَور گزُرے ہُوئے وَقت کا لمحہ لمحہ اَپنی اصل خصلت لئے، گرفت میں آجاتا تھا جِس کے نقش ونگار مہینوں اَور برسوں کی دُھند میں مدھم نہ پڑتے تھے۔ کوئی اچنبھا، کوئی اِسرار اِن کے ناک نقشے پہ شبے کا سایہ نہ ڈال سکتا تھا۔ نسرین کی آواز تک، اَپنے ہونٹوں کی خم دار ترنگ لئے کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی کرن، کھلکھلاتے دانتوں کی کٹک، لرزتی ہُوئی سُرخ زُبان کی نم دار حرارت، لمبی سفید اُنگلیوں کی لہر، جلد کی موم کے اَندر بال سے زیادہ مہین شریانوں کا جال جو چھاتی کے تناؤ کے ساتھ زیر و بم ہوتا تھا، یہ ایک ایک جزو سمٹ کر ایک دمکتے ہُوئے منجمد لمحے کی صُورت نظر کے سامنے آرُکتا تھا۔ یاد کا لنگر بھی کیا عجب شے تھی، کہ زمانوں کی آمد و رفت کو گویا مٹھی کی جکڑ میں باندھ کے رکھ دیتا تھا۔

اسی نیم خُواب حالت میں لیٹے لیٹے اَچانک سرفراز کو احساس ہُوا کہ اُس کے آس پاس مکمل سناٹا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمرہ خالی تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ پلیٹ فارم پر پیر صاحب اَور اُن کے بیٹے اَپنے مُریدوں کے ہجُوم میں گِھرے کھڑے تھے۔ مُرید ایک دُوسرے کے عقب سے نِکل نِکل کر پیر صاحب کے گھٹنوں اَور پاؤں کو چھُو رہے تھے۔ سرفراز نے ہاتھ بڑھا کر کمرے کی بتی بجھا دی۔ کوچوان کے چھانٹے کے کڑاکے، اُس نے سوچا، اَور تانگے کے پہیّوں کا شور شاید پیر صاحب کے آنے جانے کی کھڑکھڑاہٹ ہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گارڈ نے سیٹی دے دی۔ ریل جو ساکن لیٹی آہستہ آہستہ سانس لیتی ہُوئی معلُوم ہو رہی تھی دھواں کی پھنکار چھوڑ کر حرکت میں آگئی اور پلیٹ فارم کے ساتھ ساتھ رینگنے لگی۔ چند مِنٹ میں وہ سٹیشن سے نِکل گئی۔ سرفراز کھسک کر کھِڑکی کے پاس ہو بیٹھا۔ کِسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "کھانا صاحب،" آواز آئی۔ سرفراز نے اُونچی آواز سے جواب دیا، "نہیں۔"

اب باہر رات کی سرزمین تھی جہاں کچُھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

کبھی کبھی کِسی گاؤں کے گھر میں جلتی ہُوئی آگ یا لالٹین کی مدّھم سی روشنی اَندھیرے میں ایک لکیر کھینچتی ہُوئی کھِڑکی کو آر پار کاٹتی اَور سیکنڈ کے اَندر عقب کی جانب غائب ہو جاتی۔ گھُپ اَندھیرے میں دیکھتے ہُوئے ایک دُوسری تاریک کھِڑکی سرفراز کی آنکھوں کے آگے اُبھرتی ہُوئی نزدیک آنے لگی۔

یہ کھِڑکی گاؤں کے ایک مکان کی تھی جِس کی چوگاٹھ پہ ہاتھ رکھّے ایک آٹھ سالہ بچہ مبہوت کھڑا باہر کالی رات کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی پُشت پر اُس کا اٹھاون سالہ باپ چارپائی پہ پڑا اَپنی زندگی کے آخری لمحوں کے بیچ اٹکا ہُوا تھا۔

"بابا جی،" اعجاز اَپنے باپ کا ہاتھ تھامے چارپائی کے کنارے بیٹھا تھا، "آپ کی عُمر بڑی لمبی ہے، اَیسی باتیں نہ کریں۔"

"مجُھے دلاسا نہ دے،" بُوڑھے نے بمشکل اَلفاظ ادا کیۓ۔ "میری بات دَھیان سے سُن۔"

"بابا جی، اللہ آپ کا سایہ ہمارے سَر پر ہمیشہ۔۔۔۔"

"تیری ماں تو سرفراز کے پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اب وہ تیرے پاس تیری ماں کی امانت ہے۔ زمین گِنے رکھ کر تجُھے پڑھایا، تیرا بیاہ کیا۔ پہلے زمین کو چھُڑانا۔"

"بابا جی، چار سال سے نوکری کر رہا ہُوں پیسے جمع کر لئے ہیں، بس تھوڑی کسر رہ گئی ہے۔ سمجھ لو کہ زمین چھُٹ گئی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر سرفراز کو پڑھانا۔"

"بابا جی وہ پڑھ رہا ہے۔"

"بچہ لائق ہے۔ قرضہ لے لینا۔ سرفراز پڑھ لکھ کر اُتار دے گا۔ دُنیا کے کام اِسی طرح چلتے ہیں۔ دادا کا قرضہ باپ کے سر، باپ کا قرضہ بیٹے کے سر، ہماری عمُریں اِسی طرح گزُری ہیں۔ مگر اب تعلیم کا زمانہ ہے۔ میرے جیسے اَن پڑھ کو بھی اِس بات کی خبر ہے۔ تیرے بیاہ کا کوئی پھل آ جاتا تو میرا سانس آسانی سے نکل جاتا۔ مگر اللہ کی مرضی کے آگے کِس کا زور ہے۔ شکُر کر کہ بھائی احمد سے کرابت داری تھی، اُس نے اَپنی سکینہ تجھے دے دی۔ وٹے سٹے کا بندوبست بھی میرے گھر میں نہیں تھا، اللہ کی مرضی سے تیری بہن ہی کوئی نہیں۔"

"بابا جی،" اعجاز نے کہا۔ "سرفراز میرا ایک ہی بھائی ہے۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔"

بُوڑھے نے آنکھ کے اِشارے سے بیٹے کو نزدیک آنے کو کہا۔ "یہ بتا، سکینہ اُسے پیار کرتی ہے؟"

"آپ کو پتا ہی ہے۔"

"نہیں، سچی بات بتا۔ دِل سے پیار کرتی ہے؟"

"بالکل دِل سے کرتی ہے۔ اَپنے بچوں کی طرح جانتی ہے۔ اب آپ سو جائیں، بولنے سے کمزوری ہو جاتی ہے۔"

بُوڑھے نے حلق سے خُشک سی ہنسی کی آواز پیدا کی، گوچہرے کی جھُریوں میں ذرہ برابر حرکت نہ ہُوئی۔ "سرفراز کہاں ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"یہ سامنے کھڑا ہے۔"

"رات ہو گئی ہے۔" بُوڑھے نے کہا اَور ہَولے سے آنکھیں بند کر لیں۔

سرفراز کھڑکی سے اب اُس کچے کمرے کو دیکھ رہا تھا جو صحن میں بنا ہوا تھا۔ جب اُس کے باپ یعقوب اعوان کی بارہ ایکڑ زمین اُس کے قبضے میں ہوا کرتی تھی اُس زمانے میں اِس کمرے کے اَندر گیہوں اَور مکّی کی جنس، تُوڑی، اَور ایک گائے رکھی جاتی تھی۔ سرفراز کے ذہن میں سب سے پُرانی یاد اُس وَقت کی تھی جب وہ اَپنے باپ کے حساب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے صرف ڈھائی پونے تین برس کا رہا ہو گا۔ صبح مُنہ اَندھیرے اُس کی آنکھ کھلی تھی تو باپ اَور بھائی کی چارپائیاں خالی دکھائی دی تھیں۔ وہ اُٹھ کر باہر نِکل گیا تھا۔ اِس کمرے سے لالٹین کی روشنی اَور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں گائے عجیب طرح سے ڈکرا رہی تھی۔ جب بچّے نے دروازے کے اَندر قدم رکھا تو انوکھا منظر دیکھا۔ ایک آدمی نے، جو اُن کے ساتھ والے گھر میں رہتا تھا، گائے کی پُونچھ اُوپر اُٹھا رکھی تھی۔ پُونچھ کے عین نیچے گائے کے جسم سے ایک کھلونے کا سا سَر اَور دو ننھی ننھی ٹانگیں باہر نکلی تھیں جن میں ہلکا سا اِرتعاش تھا، جیسے سردی سے کانپ رہی ہوں۔ سرفراز کے باپ اور بھائی نے اُس چھوٹے سے بدَن کو چاروں ہاتھوں سے اُٹھا رکھا تھا اَور ہَولے ہَولے اُسے کھینچ رہے تھے۔ سرفراز گائے کے مُنہ سے کچھ فاصلے پر جا کر رُک گیا۔ گائے ہَو کے بھر بھر کر ڈکرا رہی تھی۔ ہر ہَو کے کے ساتھ اُس کا سارا جثہ لرز جاتا تھا۔ سرفراز کی نظریں گائے کے چہرے پر تھیں۔ چہرہ اُسی طرح تھا جیسے ہر روز ہوا کرتا تھا، صرف اُس کی آنکھوں کی صُورت مختلف تھی۔ اُن آنکھوں کی دو شکلیں تھیں۔ ایک شکل بے زُبان دہشت کی تھی، دُوسری نرمی اَور بلاوے کی تھی۔ پہلی سے سرفراز کے دِل میں کھٹکا پیدا ہوتا تھا اَور قدم پیچھے کو اُٹھتے تھے۔ دُوسری سے اُس کا جی چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر گائے کے مُنہ پر ہاتھ پھیرے۔ کمرے میں انسانی اَور حیوانی سانسوں اَور خمیرے آٹے کی سی ملی جُلی، گرم مرطُوب بُو بھری تھی جو سینے پہ بھاری بیٹھ رہی تھی۔ سرفراز اَپنی جگہ پہ کھڑا دیر تک گائے کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ جب اُس نے نظر ہٹائی تو اُس کا باپ اُس کھلونے کو جو گائے کا بچھڑا تھا گائے کے مُنہ کے نیچے سہجے ہاتھوں کھڑا کر رہا تھا اَور گائے کی پُونچھ کے ساتھ لمبا سا سُرخ گوشت کا لوتھڑا لٹک رہا تھا۔ بھُوسلے رنگ کے بچھڑے کی ٹانگیں اُس کے بوجھ سے بیٹھ بیٹھ جاتی تھیں اَور اُس کے بال یُوں چپکے ہُوئے تھے جیسے نہا کر آیا ہو۔ گائے نے دو ایک بار سَر کو اِدھر اُدھر جھٹکے دیئے، جیسے رسی تڑوانے کی کوشش کر رہی ہو، پھر اُس نے ہَولے سے سَر نیہوڑا کر بچّے کو زُبان سے چاٹنا شُروع کر دیا۔ سرفراز کو اعجاز گود میں اُٹھا کر کمرے سے نِکل آیا۔ اُس وَقت اِس کمرے کے دروازے اَور کھڑکی کے پٹ ہوا کرتے تھے جنہیں کُنڈی لگتی تھی۔ اگلے برسوں میں زمین گروی چلی گئی اَور اعجاز کی ایف۔اے تک تعلیم مکمل ہُوئی۔ پھر اُس کا بیاہ ہوا۔ کچھ عرصے تک وہ کمرہ بند رہا، پھر بے دھیانی کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نذر ہوگیا۔ آندھی طوفان میں کُنڈیاں ٹُوٹ گئیں۔ کواڑ کھٹاکھٹ بجتے رہے، پھر اُکھڑ کر گر پڑے۔ آخر میں گائے بھی بک گئی۔ کمرہ اُجڑ گیا۔ آج بھی، جب آٹھ سالہ سرفراز اَپنے تئیں بچپنے سے نِکل کر "بڑا" ہو چُکا تھا اَور چھ برسوں میں اِس کمرے کی کئی شکلیں گزر چکی تھیں، اِس کا ایک ہی نقشہ اُس کے ذہن میں موجُود تھا۔۔۔۔ باسی سانس اور گائے کی آلائش کی بھاری بُو کے اَندر جَڑا ہُوا گائے کا دو لخت چہرہ، جِس کی آنکھوں سے موت کی دہشت اَور پیار کی نرمی بیک وَقت جھانک رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے اُس نے اَپنے باپ کے چہرے پر وہی کیفیت دیکھی تھی۔ کھڑکی میں کھڑے کھڑے، تاریک آسمان پر ٹمٹماتے ہُوئے تاروں کو دیکھتے ہُوئے سرفراز کے اَندر اَپنی پُرانی گائے کے چہرے کی اَنمٹ وِیرانی کا عکس تھا جِس کی چھاپ ڈھائی سال کی عُمر میں اُس کے دِل پہ پڑ چکی تھی۔

گھر کے دروازے پہ ایک بَیل گاڑی آ کر رُکی جِس کے نیچے لالٹین لٹک رہی تھی۔ یہ اُس کی ماسی کا کُنبہ تھا۔ اعجاز کی بیوی سکینہ کے علاوہ اُن کا ایک بیٹا جو سرفراز سے ایک سال بڑا، اَور سرفراز سے دو برس چھوٹی بیٹی جمیلہ تھی۔ بچوں کے باپ چاچے احمد نے لالٹین اُتار کر ہاتھ میں لی اَور بیٹے عباس کو بَیل گاڑی پر چھوڑ کر بیوی اَور بیٹی کے ساتھ گھر کے اَندر چلا آیا۔ جب سرفراز کی ماسی اُس کا سَر مُنہ چُوم چُکی تو وہ چپکا جا کر جمیلہ کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گزُری تو وہ جمیلہ کو کہنی مار کر سرگوشی میں بولا، "چل باہر چلیں۔"

دونوں بچوں نے گھر والوں کو دیکھا جو بُوڑھے جان کن کی چارپائی کے گرد جمع تھے۔ زمین پر بیٹھے بیٹھے، ایڑیوں کی مدد سے دونوں نے اِنچ اِنچ دروازے کی جانب کھسکنا شُروع کیا۔ جب وہ دروازے کے پاس پہنچ گئے اَور پھر بھی کسی نے اُن کی طرف دھیان نہ دیا تو وہ دہلیز ٹاپ کر باہر صحن میں نِکل آئے۔

"چل اُس کمرے میں چلیں۔" سرفراز نے کہا۔

"نہ جی، وہاں تو جن ہوتے ہیں۔"

"کون کہتا ہے۔"

"باسے نے بتایا تھا۔"

"جیلو، تُو ڈرپوک ہے۔ چل، میں آگے آگے چلتا ہُوں۔"

جمیلہ سرفراز کا ہاتھ تھامے، پھُونک پھُونک کر قدم رکھتی ہُوئی اُس کے پیچھے کمرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں داخل ہُوئی۔ رات کالی تھی مگر تاروں کی لَو میں بے پٹ کی کھڑکی کا چوکھٹا مدھم سا دکھائی دے رہا تھا۔ جمیلہ مضبوطی سے سرفراز کا بازُو پکڑے اُس کے ساتھ لگ کر کھڑی کھڑکی سے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

"سرفراز،" جمیلہ نے کہا، "تو یہاں آیا کرتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا کرنے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تجھے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں۔"

"مجھے جنوں سے ڈر لگتا ہے۔"

"تو قرآن مجید پڑھتی ہے؟"

"ہاں۔ بیسویں سپارے پر ہُوں۔"

"میں نے ختم کر لیا ہے۔ مولوی جی کہتے ہیں جو قرآن مجید ختم کر لے اُسے جنوں سے ڈر نہیں لگتا۔"

"میرے دس سپارے رہ گئے ہیں،" جمیلہ نے کہا۔

"وہ دیکھ،" سرفراز نے آسمان کی جانب اُنگلی اُٹھا کر کہا۔

"کیا؟"

"ستارہ۔ کبھی غائب ہو جاتا ہے کبھی دکھائی دینے لگتا ہے۔"

"آگے بادل آگیا ہے۔"

"نہیں، آنکھیں جھپک رہا ہے" سرفراز نے کہا۔ "مجھے پتا ہے۔"

"کیسے؟"

"ایک دِن مجھے سب کچھ پتا چل جائے گا" سرفراز نے سینہ پھُلا کر کہا۔ "میں کتاب میں پڑھوں گا۔"

"چلو چلیں" جمیلہ نے کمرے میں ہوا کی سرسراہٹ سُن کر مزید قریب سرکتے ہُوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کہاں؟"

"گڈے پر۔"

"میں نہیں جاتا۔"

"کیوں؟"

"باسا مجھے مارتا ہے۔"

"ابا اُسے اندھیرے میں بٹھا کر چلا جاتا ہے، اِس لئے غصہ کرتا ہے۔"

"بئی مان ہے،" سرفراز نے کہا، "مارتا ہے۔"

"تُو میرے اَبے کو بتانا۔"

"تجھے ڈر لگ رہا ہے؟"

"ہاں" جمیلہ بولی۔ "چل چلیں۔"

گھر کے دروازے پر عباس اندھیرے میں بَیل گاڑی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ سرفراز اور جمیلہ پچھلے تختے پر ہاتھ جما کر اُچکے اَور سوار ہو کر، ساتھ ساتھ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔

"اوئے سرفرازے، تیرا ابا مر گیا کہ نہیں؟" عباس نے پُوچھا۔

"ابھی نہیں۔" جمیلہ چُستی سے بولی، "سانس لے رہا ہے۔"

بیل نے سر جھٹکا تو اُس کے گلے میں لٹکی گھنٹی کی آواز آئی۔

"سرفرازے ٹانگ نہ ہِلا، ڈنگر بے قرار ہوتا ہے۔"

"میں تو نہیں ہِلا رہا" سرفراز نے جواب دیا۔

"اور تیرے فرشتے ہِلا رہے ہیں؟ چل اُتر نیچے۔"

سرفراز چھلانگ لگا کر بَیل گاڑی سے اُتر گیا۔

"گڈے کے نیچے جا کر بیٹھ" عباس نے حکم دیا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے" سرفراز نے کہا۔

"تیرا ڈر نکالوں آ کر؟ چل نیچے بیٹھ۔"

سرفراز چاروں ہاتھ پاؤں پہ چلتا ہوا بَیل گاڑی کے نیچے گھُس گیا۔

"چل جیلو، تو بھی اُتر" عباس بولا، "باسے" جمیلہ نے فریاد کی، "نیچے سانپ ہیں۔"

"چل چل، ابھی تیرے سانپ نکالتا ہُوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جمیلہ بھی رینگتی ہُوئی جا کر سرفراز کے پاس بیٹھ گئی۔ عباس کے ڈر کے مارے سرفراز اور جمیلہ بیل گاڑی کے نیچے، اُس کے پہیے سے پُشت لگائے ساتھ ساتھ دبکے بیٹھے تھے۔ تاریکی اتنی تھی کہ ایک دُوسرے کی شکل دکھائی نہ دیتی تھی، صرف سانس کے اُتار چڑھاؤ سے جمیلہ کا بدن بار بار سرفراز کے جسم کے ساتھ ہولے سے دبتا تو اُس کے اندر ایک خُوش گوار حرارت کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ بیل گاڑی گلی کی چوڑائی جتنی چوڑی تھی اور پھنس کر گلی میں داخل ہُوئی تھی۔ آتے جاتے اِکا دُکا لوگ گلی کی دِیواروں کے ساتھ گھسٹتے ہُوئے نِکل رہے تھے۔ گلی کے بیچ میں بہتی ہُوئی نالی میں بیل کا ایک کھُر ڈوبا تھا جسے وہ بار بار پانی سے باہر نکال کر خُشک زمین پہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نالی کے گندے پانی کی بُو سرفراز اور جمیلہ کی ناک میں چڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک اِسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد جمیلہ نے سرفراز کے کان میں کہا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"تجھے ہر وقت ڈر لگتا رہتا ہے۔" سرفراز نے کہا۔

"چپ کر کے بیٹھو" اُوپر سے عباس بولا، "نیچے اُتر کر دونوں کے دانت توڑ دوں گا۔"

گاڑی کے نیچے دونوں پھر دبک گئے۔ اسی خاموشی میں جب کافی دیر گزر گئی تو سرفراز نے جمیلہ کو کہنی مار کر سرگوشی کی، "چل اندر چلیں۔"

دونوں بے آواز طور پہ رینگتے ہُوئے دُوسرے پہیے تک پہنچے، پھر وہاں سے نِکل کر بھاگ کھڑے ہُوئے۔ اندھیرے میں دروازے کی دہلیز سے دونوں کے پاؤں کو ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے مُنہ صحن میں گر پڑے۔ مگر ڈر کے مارے اُن کی ٹانگیں چلتی رہیں۔ وہ کُود کر اُٹھے اور دوڑتے ہُوئے صحن پار کر کے اندر چلے گئے۔

قریب سحری کا وقت ہو گا جب شور سے سرفراز کی آنکھ کھلی۔ وہ چارپائی پہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جمیلہ دُوسری چارپائی پر سو رہی تھی۔ سرفراز چارپائی سے اُتر کر دروازے تک گیا۔ دُوسرے کمرے میں لالٹین کی روشنی کے آگے اُس کی ماسی زمین پر بیٹھی دونوں بانہیں ہوا میں اُٹھائے عجیب سی آواز میں بین کر رہی تھی۔ چارپائی پر، جہاں اُس کا باپ پچھلے دو ماہ سے دراز رہا تھا، صرف ایک سفید کھیس بچھا نظر آ رہا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چارپائی خالی ہو گئی ہے، گو سرفراز کو احساس تھا کہ اُس کے باپ کا جسم جو ایک پُرانے کپڑے کی مانند سکڑ کر رہ گیا تھا، کھیس کے نیچے ڈھکا پڑا تھا۔ سرفراز چلتا ہوا جا کر کمرے میں ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں ماسی پر لگی تھیں جس کے ہاتھ اُوپر اُٹھے تھے اَور جو چہرہ چھت کی جانب کئے، مُنہ کھولے آہ و بکا کر رہی تھی۔ سرفراز یُوں کھڑا تھا جیسے ماسی کے انداز سے مسحور ہو چُکا ہو۔ اُسے ذرہ برابر احساس نہ تھا کہ ماسی رو رہی ہے۔ ماسی کے چہرے پہ پسینے کے باریک قطرے چمک رہے تھے، مگر اُس کی آنکھیں خُشک تھیں۔ سرفراز وہاں کھڑا اِنہماک سے اُس کی آواز کے زیر و بم میں کھویا ہُوا تھا۔ چاچا احمد، جو اب تک مُنہ دُوسری جانب کئے حُقّہ گُڑ گُڑا رہا تھا، جیسے اُس کا اِس ساری کارروائی سے کوئی تعلق نہ ہو، اَور جسے دیکھ کر ہمیشہ سرفراز کو ایک بڑے بھاری درخت کا احساس ہوتا تھا، اب کبھی ایک پاؤں پہ اَور کبھی دُوسرے پہ اَپنے جسم کا بوجھ سہارتا ہوا دائیں سے بائیں ہَولے ہَولے جھُوم رہا تھا۔ اِتنے میں ماسی کی نظر بچّے پہ پڑی جو ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بازُو گرا کر اَپنے آپ کو سکینہ سے جُدا کیا جو اُس کے بدَن سے لپٹی ہُوئی تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ سیدھی پاؤں پہ اُٹھ کھڑی ہُوئی اَور جھپٹ کر سرفراز کو بانہوں میں سمیٹنے کے بعد اُسے سینے سے لگا کر دُوسرے کمرے کو لے چلی۔ اعجاز اَپنے باپ کی چارپائی پہ سَر رکھے بے حرکت بیٹھا تھا۔

دُوسرے کمرے میں ماسی سرفراز کو اُس کی چارپائی پہ لٹا کر خُود اُس کے ساتھ لیٹ گئی۔ پھر وہ سرفراز کو اَپنے بازُوؤں کے حلقے میں سینے سے لگا کر آہستہ آہستہ سسکنے لگی، جیسے درد سے کراہ رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد سرفراز کو اَپنے گال پہ نمی کے قطرے محسُوس ہُوئے۔ اُس نے سَر اُٹھا کر دیکھا تو اُسے یقین نہ آیا۔ اُس نے دوبارہ دیکھا۔ ماسی چُپکے چُپکے رو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے، جو بین کرتے ہُوئے خُشک تھیں، اب سچ مُچ کے آنسو رواں تھے۔ سرفراز نے اَپنی ماں کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اُس کی ماسی نے ہی اُسے پالا تھا۔ جب وہ تین سال کا ہو گیا تو اُس کا باپ اُسے اَپنے پاس لے آیا تھا۔ اعجاز سے بیاہ ہو کر سکینہ کی آمد کے بعد وہ دو دو، تین تین ہفتے آ کر اَپنی بیٹی کے پاس ٹھہرنے لگی تھی۔ سرفراز کو وہ وَقت یاد آیا جب ایک بار چاچے احمد نے جھگڑا کر کے ماسی کو گھر سے نکال دیا تھا اَور ماسی اُن کے گھر آ کر تین مہینے رہی تھی۔ سرفراز اُس وَقت چھ سال کا ہو گا۔ گرمیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے دِن تھے۔ ایک روز دوپہر کو سرفراز اَپنے باپ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اَندر داخل ہوا تو چارپائی پر ماسی کو اَپنے باپ کے برابر لیٹے ہُوئے پایا۔ سرفراز کو دیکھتے ہی ماسی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ عجلت میں وہ اپنا گریباں بند کرنا بھی بھول گئی اَور جلدی سے سرفراز کے باپ کی ٹانگیں دبانے لگی۔

"ہائے، بھائی یعقوب کے بدَن میں درد اُٹھ رہا ہے،" وہ آنکھیں چرا کر بولی، "شاید بخار آنے والا ہے۔"

"تُو یہاں کیا کر رہا ہے سرفرازے،" اُس کا باپ غصّے سے بولا، "میرا بدَن ٹُوٹ رہا ہے۔ تیری ماسی سے کہا ہے ذرا دبا دے۔ اَور کِس سے کہوں؟ تیری ماں تو تجھے میرے پیٹے ڈال کر چھوڑ کر چلی گئی۔ جا، دروازہ بند کر دے، روشنی سے میری آنکھوں میں ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ جا۔"

اب گھر والوں سے الگ ہو کر، اَندھیرے کمرے میں ماسی آنسو بہا رہی تھی۔ سرفراز کو احساس تھا کہ اُس کا باپ مر چُکا ہے، مگر اُس کے دِل میں رنج کی کوئی شکل پیدا نہ ہو رہی تھی۔ اُس کے دِل کی ایک کیفیت تھی جِس سے وہ شُروع عُمر سے واقف تھا مگر جِس کی خصلت اُس کے تئیں بے نام ہی رہی تھی۔ ایک زمانہ گزر گیا تو پھر جا کر اُسے علم ہُوا تھا کہ یہ کیفیت ایک ایسی خُواہش کے مطابق تھی کہ جیسے دُور دراز کے خیالوں کے اَندر، آس پاس کی چیزوں کے نشان لگانے کی اُمنگ ہو، اَور بس۔ اُس وَقت ماسی کے ساتھ لیٹے لیٹے اُس کا جی گھبرانے لگا تھا۔ سب سے اوّل اُس کی خُواہش تھی کہ وہ ماسی کے بازُوؤں کے حلقے سے نِکل کر اُس کے آنسوؤں سے دُور چلا جائے۔ جب وہ ماسی کے جسم سے الگ ہونے میں ناکام رہا تو سسکنے لگا تھا۔ اِسی حالت میں کچُھ دیر کے لئے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اَچانک اُس نے اَپنے کندھے پر ایک مانُوس ہاتھ کو محسُوس کیا۔ وہ اُچھل کر اُٹھا اَور اعجاز کے ہاتھوں سے چمٹ کر اُس کے کندھے سے لگ گیا۔ کافی مُدّت پہلے اُس نے اعجاز کی گود میں چڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اِس طرح اُس کے سینے سے چمٹا تھا جیسے آٹھ برس کا پٹھا نہیں بلکہ گھٹنوں چلتا بچہ ہو۔ اُسے اِس سارے ماحول سے، اَپنے تاریک کمرے سے، دُوسرے کمرے سے جہاں لالٹین لٹک رہی تھی اَور سفید کھیس والی چارپائی بچھی تھی، ماسی کی گرم گرم چھاتیوں اَور اُس کے آنسوؤں سے، ڈر محسُوس ہو رہا تھا۔ اعجاز کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کندھے پر سر رکھ کر اُسے اعتبار آ گیا کہ اب کسی بات کا خوف دُور دُور تک بھی پھٹکنے والا نہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باب 2

یعقوب اعوان نے سُن رکھا تھا کہ وَقت مرگ اِنسان کی آنکھوں کے سامنے سے اُس کی ساری زِندگی لمحے بھر کے وقفے کے اَندر گزُر جاتی ہے۔ مگر مَوت کو بالمقابل پا کر اُسے صرف دو چار ہی مناظر دکھائی دیئے--- جِن کے بیچ سالوں کی مُدّت پڑتی تھی۔

سب سے پہلے اُسے اپنے آبائی گاؤں کا ایک رُخ نظر آیا۔ یہ گاؤں کا ماتھا تھا جِس کے ساتھ اُس کی گہری اَور طویل آشنائی تھی، کہ اِس طرف اُس کے کھیت پڑتے تھے۔ صُبح اَور شَام، اپنی پچاس سالہ زِندگی کے ایک ایک دن---- صرف جنگ کے تین سال چھوڑ کر---- یعقوب اعوان نے کھیتوں سے گھر کو لوٹتے ہُوئے گاؤں کا یہ رُخ دیکھا تھا۔ یہ رستہ اُس کے اپنے گھر کی مانِند تھا جہاں اُسے نظر کی حاجت نہ ہوتی تھی۔ گھپ اَندھیرے میں وہ اَندر اَور باہر چل پھر سکتا تھا۔ بستر مرگ پر سب سے اوّل اُسے یہ منظر دکھائی دیا جِس کی کچی دیواروں کا نقشہ ایک جھلی کی مانِند اُس کے دماغ پہ پھیلا تھا۔ یعقوب اعوان پچاس برس کی عُمر کو پہنچا تھا کہ وہ گاؤں جِس میں وہ پیدا ہُوا تھا اُس سے چھُٹ گیا تھا۔ پچھلے آٹھ برس کے عرصے میں اُس نے اپنے گاؤں کی یہ شکل صرف ایک بار دیکھی تھی، اَور وہ بھی محض ایک رات کے اَندھیرے میں۔ چوروں کی مانِند، تاریکی کے اَندر وہ اُس گاؤں میں داخل ہُوا تھا جو اب ایک مُختلف سرزمین پہ کھڑا تھا، اَور راتوں رات نِکل آیا تھا۔ اس گمشدہ منظر کے ساتھ یعقوب اعوان کے سامنے پھر اپنے باپ کا چہرہ اُبھرنا شُروع ہُوا۔ ایوب اعوان کے تانبے کی رنگت والے چہرے پر بڑی بڑی پھیلی ہُوئی مونچھیں تھیں اَور چوکور ماتھے کے اُوپر بیچ سَر سے چیر نِکلے بالوں کے لمبے لمبے پٹے تھے جنہیں وہ دِن بھر لکڑی کے باریک کنگھے کی مدد سے سَر پہ جماتا رہتا تھا، گو بڑھاپے میں پہنچ کر اُس کے بال سفید ہو گئے تھے اَور رنگت سانولی پڑ گئی تھی، مگر مرنے والے کو اپنے باپ کی جوانی کی صُورت ہی نظر آئی جو اُس نے بچپن میں دیکھی تھی۔ لمبے اَور گٹھے ہُوئے بدَن والا وہ آدمی ایک تناور پیڑ کی مانِند تھا جِس کے بارے میں مشہور تھا کہ جوانی کے دنوں میں سِکھوں کے ایک جتھے میں شامل تھا جو علاقے میں مویشیوں پہ ڈاکے ڈالا کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ایوب اعوان کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جوانی کا یہ عالم تھا کہ جوان بچھڑی کو کاندھوں پہ اُٹھا کر کھلیان کی دیوار سے باہر پھینک دیتا تھا اَور دُودھ دیتی بھینس کے سینگوں کو ہاتھوں میں دبوچ کر ایک ہی مروڑ سے زمین پہ چت کر دیتا تھا۔ مگر گھر بسانے کے ساتھ ہی قدرت کی طرف سے اُس کی زِندگی میں سدھار آگیا تھا اَور وہ اپنی آدھا مربع آبائی زمین کی کاشت پر قناعت سے گزُر بسر کرنے لگا تھا۔ امرتسر کے نواح میں سِکھوں کے اُس چھوٹے سے گاؤں، کبیر سِنگھ والا میں اعوانوں کا ایک ہی مُسلمان گھرانہ تھا۔ کچُھ اِس بنا پر اَور باقی کچُھ اِس وجہ سے کہ اپنی قوم کو نام کا اٹُوٹ انگ بنانا اعوانوں کی ریت تھی، دونوں باپ بیٹا ایوب اعوان اَور یعقوب اعوان کے پورے پُورے ناموں سے پکُارے جاتے تھے۔ اپنے باپ کا چہرہ دیکھتے ہُوئے یعقوب اعوان کے آہستہ آہستہ سرد ہوتے ہُوئے خُون میں ایک ہلکی سی لہر پیدا ہُوئی۔ اب اُس کو اُس رات کی تصویر نظر آ رہی تھی جِس کی صُبح کو وہ پہلی بار اپنا گاؤں چھوڑ کر گیا تھا۔

سحری کا وَقت تھا اَور یعقوب اعوان اپنے بیلی جگت سِنگھ کے ساتھ گاؤں کے ایک مکان کی دیوار کے سائے میں کھڑا تھا۔ تیرھویں کے چاند کی رات تھی، گاؤں کی دیواریں اَور گلیاں ایک بے اصل سے ؛ودھیا رنگ میں رنگی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ باقی سارے گاؤں پر ہُو کا عالم تھا، سوائے اِس .نے کے، جہاں مکان کے کوٹھے پہ لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا جھرمٹ چاندنی میں بَیٹھا تھا۔ اُس کُروہ کے بیچ سے اُونچی سرگوشیوں اَور کھی کھی ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نیچے گلی میں جگت سِنگھ مدہوش کھڑا، ہاتھ میں کلونت کور کی ایک جُوتی لئے، مُنہ اُٹھائے اُس کی منتیں کر رہا تھا۔ پاس یعقوب اعوان کھڑا ہنس رہا تھا۔

شُروع رات سے وہ دونوں جگت سِنگھ کے بڑے بھائی بھگت سِنگھ کے بیاہ کے میلے میں گاؤں کی گلیوں میں موج اُڑاتے پھرے تھے۔ اِس وَقت جَب میلہ ختم ہوچُکا تھا اَور سب لوگ تھک ہار کر سو چکُے تھے، جگت سِنگھ کو کوٹھے پر کلونت کور کی خبر ملی تھی، اَور وہ ایسا جم کر وہاں کھڑا ہوگیا تھا کہ ہلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ دونوں لڑکے مسلسل ایک دِن اَور ایک رات کے جاگے ہُوئے تھے۔ چوبیس گھنٹے پہلے وہ بارات کے لئے اُٹھے تھے۔ پھر دِن چڑھے وہ گھڑ سواروں، تانگوں، بَیل گاڑیوں اَور پیدلوں کی بارات لے کر گاؤں سے روانہ ہُوئے تھے۔

بھگت سِنگھ سَر پہ کیسری پگڑی باندھے، گلے میں بوسکی کا کُرتہ اَور کمر میں سُرخ لاچہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنے، بغل میں کرپان لٹکائے دولہا بنا، سفید گھوڑی پہ سوار بارات کے بیچ مُنہ زور گھوڑی کی باگ کھینچے اُسے قدم قدم چلاتا جا رہا تھا۔ اُس کی پُشت پر اُس کا بارہ سالہ تایا زاد بھائی اُدھم سنگھ ایک ہاتھ میں اپنے جتنی لمبی ننگی تلوار تانے اَور دُوسرا ہاتھ بھگت سنگھ کی کمر میں ڈالے اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔ آگے آگے دو میراثی ڈھولوں پر مُستقل میلے کی تھاپ دیئے جا رہے تھے جن کی دھمک سے گھوڑی بار بار بدکتی تھی اور اُدھم سنگھ کو تلوار سنبھالنی مشکل ہو رہی تھی۔ ایوب اعوان بھگت سنگھ کے باپ اَور اُس کے بھائیوں کے ہمراہ جو اپنی اپنی گھوڑیوں پہ سوار تھے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ایک تانگے اَور ایک بیل گاڑی میں عورتیں رنگین کپڑے، چاندی کے زیور اَور تِلّے والے لمبے لمبے چمک دار پراندے پہنے ایک دُوسری سے ٹھس کر بیٹھی تھیں۔ ادھیڑ عُمر عورتیں لڑکیوں پہ نظر رکھے ہُوئے تھیں اَور ہر چند منٹ کے بعد اُنہیں سینہ ننگا رکھنے اَور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنے پر سرزنش کر رہی تھیں۔ اِس کے باوجُود لڑکیاں بالیاں جگت سنگھ اَور یعقوب اعوان کو دیکھ دیکھ کر، جو دونوں ایک ہی خچر پہ سوار ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے، اٹھکیلیاں کرنے سے باز نہ آتی تھیں۔ گاؤں کی سب سے سَر نکالتی ہُوئی نیار کلونت کور وعدے کے باوجُود بارات کے ساتھ نہ آئی تھی۔ جگت سنگھ کلونت کور پہ عاشق تھا اَور اُس کی متلاشی آنکھیں بھٹکی پھرتی تھیں۔ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے اُس نے دارو کے چند گھونٹ چڑھائے تھے اَور اُن کی مستی میں وہ کبھی کبھی خچر کو ایڑ لگاتا اَور بیل گاڑی میں بیٹھی ہُوئی کسی لڑکی کا پراندہ اُچک کر اُسے تنگ مارتا۔ لڑکی ہلکی سی چیخ مارتی اَور دونوں ہاتھوں سے اپنا پراندہ کھینچنے لگتی۔ جگت سنگھ پراندہ ہاتھ سے چھوڑتا تو لڑکی اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکیوں پر ڈھے جاتی۔

"ہائے جگو مشٹنڈا،" لڑکی سُرخ سُرخ مُنہ سے بولتی، "جا اپنی ماں کا پراندہ پکڑ۔"

"پراندہ ہی ہے، نالا تو نہیں،" جگت سنگھ جواب دیتا، "نالے کو تو جندا لگا کے رکھتی ہو۔"

"ہائے بے شرما۔"

لڑکیاں کھی کھی کر کے ہنستیں۔ کچھ دیر تک جگت سنگھ پر مستی کی لہر رہتی، پھر وہ ٹھنڈا پڑ جاتا۔ اُس کی آنکھیں ایک بار پھر کلونت کور کی تلاش میں وحشی ہو جاتیں۔

چلتے چلتے بارات کے بیچ ہلکی سی کھلبلی مچ گئی۔ دولہے کی گھوڑی سیخ پا ہو رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھگت سنگھ ایک ہاتھ سے باگیں مروڑے، دُوسرے سے گھوڑی کی گردن کو تھپکیاں دے کر رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے پیچھے اُدھم سنگھ گھوڑی کی پیٹھ سے پھسلا ہی چاہتا تھا۔ وہ دیر سے شکایت کر رہا تھا کہ بھاری تلوار اُس سے سنبھالی نہیں جاتی۔ آخر جب گھوڑی دُوسری بار اگلی ٹانگیں ہوا میں اُٹھا کر سیدھی کھڑی ہُوئی تو اُدھم سنگھ نیچے آگرا۔ جب وہ زمین سے اُٹھا تو اُس نے تلوار ہاتھ سے چھوڑ دی اَور رونے لگا۔ "میرا مونڈھا دُکھ دے رہا ہے۔" اُس نے فریاد کی۔

اُس کے باپ نے بڑھ کر اُسے تھاما۔ "جسونت سیہناں، لڑکے کا گُٹ سُوج گیا ہے" اُدھم سنگھ کا باپ اپنے چھوٹے بھائی سے بولا، "اِس کی بانہہ نکارہ کرنے کی صلاح ہے؟ لے اپنی تلوار۔"

جسونت سنگھ نے گھوڑی سے اُتر کر تلوار پکڑی اَور اُسے نیام میں ڈال کر اُدھم سنگھ کے سَر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ "چل اَیسے ہی بیٹھ جا، کوئی بات نہیں۔ ڈُھڈّی والے پہنچ کر تھوڑی دیر کے لئے پکڑ لینا۔ چل چل، بیاہ کے مَوکے پر رویا نہیں کرتے۔"

ڈُھڈّی والا دُلہن کے گھر کا گاؤں تھا جو لاہور سے چند کوس اُدھر واقع تھا۔ کچھ بیاہ کی رنگینی کے نشے میں اَور کچھ ڈھولوں کی لہو اُچھالنے والی تھاپ کے زور پر آخر بارات بیس میل کا سفر طے کر کے دوپہر کے وَقت جب سُورج سَر سے ڈھلنے پہ آن لگا تھا، لڑکی کے گاؤں میں داخل ہُوئی۔ ڈھول بجانے والوں نے میزبانوں کے گھر کے آگے جم کر ایک تال پر اَیسی دھمک اُٹھائی کہ بُڈھے بُڈھے سِکھ مستی میں آ کر ناچنے لگے۔ گاؤں کے بھانڈوں میراثیوں نے آ کر پنڈال لگایا اَور اپنے ٹُوٹکے سُنا سُنا کر اَور بارات والوں پر پھبتیاں کس کس کر ویلیں وصُول کیں۔ کھانا لایا گیا تو تھکے ہارے اَور بھوکے باراتی اُس پہ ٹُوٹ پڑے۔ اُس کے بعد شادی کی رسُومات مکمل کی گئیں۔ جب رُخصتی کا وَقت آیا تو حسب معمول جھگڑا ہونے لگا۔ جھگڑے کی بنیاد جہیز کے ایک پلنگ کے پائے تھے۔

"تُم نے روغنیوں کی زبان کی تھی،" بھگت سنگھ کا باپ گرجا۔ "قول سے پھر گئے ہو بنیٔ مانو؟"

"یہ دیکھ، آنکھوں کے اندھے"، لڑکی کے باپ نے پایوں کی جانب اشارہ کر کے کہا، "تجھے کیا دکھائی دیتا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اُوپر ماں کی سُرخی لگا دی تو روغنی ہو گئے؟ ہماری پڑتی ہُوئی ہے۔"

"چُپ کر، اُوپر کا بول بولا تو خالی ہاتھ واپس کر دوں گا۔"

بھگت سنگھ لوگوں کو ہٹا کر آگے بڑھا اَور دھم سے ایک گھونسا دلہن کے بھائی کے مُنہ پر جڑ دیا۔ لڑکے کی ناک سے خُون بہنے لگا۔ دُلہن کے دُوسرے بھائی نے جوابی گھونسا بھگت سنگھ کے مُنہ پہ رسید کیا، جس سے بھگت سنگھ کی آنکھ پہ دیکھتے ہی دیکھتے سُوجن اُٹھنے لگی۔ چھڑانے بچانے والوں کی افراتفری کے بیچ اُدھم سنگھ عقب میں دبکا کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں اب تلوار کی بجائے ننگی کرپان تھما دی گئی تھی اَور اُس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا اب رویا کہ اب رویا۔ ہاتھا پائی کے دائرے کے باہر لوگ کھڑے ہنس رہے تھے۔ "گھبراؤ نہیں، بھائی جی،" بھگت سنگھ کا چچا ایک بزرگ سکھ مہمان سے، جو شکل وصُورت سے شہر کا باسی دکھائی دیتا تھا، کہہ رہا تھا، "یہ ہماری ریت ہے۔"

"یہ کیسی ریت ہے؟"

"بھائی جی، جوان اگر زور بازُو سے پتنی کو لے کر نہ جائے تو اُس کی کیا عزت رہ جائے۔"

دِن ڈھل رہا تھا جب بارات ڈولی لے کر بیس میل کے واپسی سفر پہ روانہ ہُوئی۔

رات بھیگ چکی تھی۔ بھگت سنگھ کے باپ کے دالان اَور صحن میں مرد بیٹھے تھے اَور اُس کے بڑے بھائی کے گھر میں عورتیں جمع تھیں۔ بیچ میں ایک دیوار تھی۔ بُڈھے اَور ادھیڑ عُمر کے مرد دِن بھر کی مسافت سے تھک کر ایک دُوسرے کی پُشت سے پُشت لگائے بیٹھے کیکر اَور گڑ کا تند دارو پی رہے تھے۔ کبھی کبھی اُن میں سے کوئی ایک اچانک واہگرو کا لایعنی سا نعرہ لگا کر اُونگھنے والوں کو چونکا دیتا۔ جو جاگ رہے تھے وہ اُونچی نیچی آوازوں میں کھیتوں کھلیانوں کی باتوں کے بیچ بیچ، گزری ہُوئی جوانیوں کے قصے دُہرا کر اِس رات کی رات اپنی زندگی کی للکار کو دوبارہ جگانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ وہ جو جوان تھے اُن کے سامنے ایسے وَقت کو مُڑ کر دیکھنے کے لئے ابھی عُمر بھر کی مہلت پڑی تھی۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی زِندگی کی دل فریبی سے یکسر بے خبر، دارُو کی ترنگ، برق رفتار گھوڑیوں کے طلسم اَور نوخیز لڑکیوں کے گیتوں کی آوازوں میں گُم تھے۔ تیرھویں رات کا چاند بیچ آسمان میں کھڑا تھا۔ دیوار کی دُوسری جانب کاتک کی سرد رات کے اَندر چاندنی میں نہائے ہُوئے صحن میں عورتوں کے چھوٹے چھوٹے جمگھٹ بکھرے تھے۔ بُوڑھی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو جانے کی بجائے موٹے موٹے کھیسوں میں لپٹی لپٹائی، سکڑ کر زمین پہ سو رہی تھیں۔ جو اُدھیڑ عُمر تھیں وہ اپنے خاوندوں، بیٹوں اَور بیٹیوں کے دیئے ہُوئے دُکھوں سے اٹے ہُوئے چہرے اُٹھائے، سپاٹ آوازوں میں پُرانی شادیوں کے شغب کا ذکر کر کر کے دلوں کو تازہ کرنے کا سامان کر رہی تھیں۔ صرف کچی عُمر کی اَور جوان لڑکیاں ٹولیوں میں بٹی، تھکن سے بے نیاز، اِدھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں۔ ایک بیباک ٹولی کوٹھے کی دیواروں سے لپٹی، مردانے صحن میں بیٹھے لڑکوں کی ایک ٹولی کو تاک تاک کر آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھی اَور اِکّا دُکّا اُن میں سے اپنی بانہیں لہرا کر چاند کی روشنی میں چُوڑیاں چمکا رہی تھیں۔ اُن کے نیچے صحن کے ایک کونے میں ایک دُوسری ٹولی ڈھولک لئے بیٹھی تھی۔ جب بھگت سِنگھ کی دُلہن گھر میں داخل ہُوئی تھی تو یہ ڈھولک اپنی بہار پر تھی۔ گاؤں کی ماہر ڈھولک نواز عورتیں، جن میں میراثنیں بھی تھیں، باری باری ڈھولک پر قبضہ جما کر شادی اَور دُلہا دُلہن کی آمد کے مقبول عام گیت گا رہی تھیں۔ اُس ایک گھنٹے کے دوران ڈھولکی اَور لڑکیوں کے گیتوں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ مگر رات گہری ہونے کے ساتھ ڈھولک کی تھاپ ہلکی پڑ چکی تھی اَور لڑکیوں کے ابتدائی چیختے چلاتے ہُوئے گیت اب نرم سُروں میں اُٹھ رہے تھے۔ جیسے کہ بیاہ کی گہما گہمی سے گزُر کر اِن گیتوں نے اپنا سارا بوجھ جھٹک دیا ہو اَور نو عُمر بدَنوں کی تانِند نکھرے نکھارے ہوئے، اب ان لڑکیوں کی اپنی بے معلوم اُمنگوں کا پیغام دے رہے ہوں۔ ٹھہری ہُوئی سرد رات کی لہروں پر گیت کے بول چھلاووں کی طرح اُبھرتے اور ڈوبتے، اٹھکیلیاں کرتے ہُوئے فضا میں بکھر رہے تھے۔

ساتھ والے صحن میں یعقوب اعوان دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے شُروع رات میں دارو کے صرف چند گھونٹ ہی چکھے تھے اَور اِس وَقت پُورے ہوش میں تھا۔ جگت سِنگھ کٹورے کے کٹورے چڑھا کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر اُس کے پاس زمین پہ پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ دیر تک یعقوب اعوان وہاں بیٹھا ڈھولک کی سُست سی تھاپ اَور